

مغربی تعلیم کا زہر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اہل نظر جانتے ہیں کہ انسانی وجود کی طرح نظام تعلیم بھی اپنی ایک روح اور ضمیر رکھتا ہے۔ یہ روح اور ضمیر دراصل اس کے واضعین و مرتبین کے عقائد و نفسیات، زندگی کے متعلق ان کے نقطہ نظر، مطالعہ کائنات و علم اسماء کی اساس و مقاصد اور ان کے اخلاق کا عکس اور پرتو ہوتا ہے، جو اس نظام کو ایک مستقل شخصیت، ایک مستقل روح اور ضمیر عطا کرتا ہے۔ یہ روح اس کے پورے ڈھانچے، ادب و فلسفہ، تاریخ، فنون لطیفہ، علوم عمرانیہ، حتیٰ کہ معاشیات و سیاسیات میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے کہ اس کو اس سے مجرّد کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ یہ بہت بڑے صاحب اجتہاد اور اعلیٰ تنقیدی صلاحیت رکھنے والے کا کام ہے کہ اس کے مفید اجزاء کو مضرا جزا سے الگ کر کے ”خدماء صفا و دُع ماکدر“ پر عمل کرے اور اصل وزائد میں فرق کر کے اس کا جوہر اور اس کی روح لے لے۔ طبعی و تجربی (سائنٹفک) علوم میں یہ کام بہت زیادہ مشکل نہیں، لیکن ادب و فلسفہ اور علوم عمرانیہ میں یہ کام بڑا مشکل اور نازک ہے، خاص طور پر جب کوئی ایسی قوم جو متعین و محکم عقائد، مستقل فلسفہ حیات اور مسلک زندگی، اپنی ایک مستقل تاریخ جو محض ماضی کا ایک لمبہ (Debris) نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے لئے پیغمبر کی شخصیت اور اس کا زمانہ آئیندگی کی حیثیت رکھتا ہے، جب کسی ایسی قوم یا دور کا نظام تعلیم قبول کرتی ہے، جو اساس و بنیاد اور مثال و معیار میں اس سے مختلف بلکہ اس کی ضد واقع ہوئی ہے، تو قدم قدم پر تصادم ہوتا ہے اور ایک کی تعمیر دوسرے کی تخریب اور ایک کی تصدیق دوسرے کی نفی و تردید، ایک کا احترام دوسرے کی تحقیر کے بغیر ممکن نہیں، ایسی حالت میں پہلے جنی کشمکش، پھر عقائد میں تزلزل، پھر اپنے دین سے انحراف اور قدیم افکار و اقدار کے بجائے جدید افکار و اقدار کا آنا ضروری ہے۔ کسی قسم کی خوش نیتی، ضمیر کی خلش، سرپرستوں کی خواہش، خارجی و جزائی عوامل اور اس کے رفاکار کوسٹ اور اس کے

دفعہ کو موخر کر سکتے ہیں، ملتوی نہیں کر سکتے۔ درخت اگر اپنے طبعی نظام سے نشوونما پائے تو وہ اپنے برگ و بار ضرور پیدا کرے گا اور وقت پر پھل لائے گا۔ انسانوں کو اس کا اختیار ہے کہ درخت نہ لگائیں یا اس کو پانی نہ دیں یا جب تیار ہو تو اس کی ہستی کو ختم کر دیں مگر اس کا اختیار نہیں کہ ایک توانا و تندرست، سرسبز و شاداب درخت کو اپنے نوعی وجود و شخصیت کے اظہار اور وقت پر پھول لانے سے روک سکیں۔

یہی معاملہ مغربی نظام تعلیم کا ہے وہ اپنی ایک روح اور اپنا ایک منفرد ضمیر رکھتا ہے جو اپنے مصنفین و مرتبین کے عقیدہ و ذہنیت کا عکاس، ہزاروں سال کے طبعی ارتقاء کا نتیجہ، اہل مغرب کے مسلمہ افکار و اقدار کا مجموعہ اور ان کی تعبیر ہے۔ یہ نظام جب کسی اسلامی ملک یا مسلمان سوسائٹی میں نافذ کیا جائے گا تو اس سے ابتداءً ہی کشمکش، پھر اعتقادی تزلزل، پھر فحشی اور بعد میں (الا ماشاء اللہ) یعنی ارتداد و قدرتی ہے۔ ایک سلیم الطبع مغربی مصنف محمد اسد، سابق (Leopold Weiss) جس کو مغرب کے نظام تعلیم اور مشرق میں اس کے نتائج کا وسیع تجربہ ہے، صحیح لکھا ہے:

”..... ہم نے گزشتہ صفحات میں اس بات کی تائید میں چند اسباب و دلائل پیش کئے ہیں کہ اسلام اور مغربی تمدن جو زندگی کے دو متضاد نظریوں پر قائم ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔ جب واقعہ یہ ہے تو ہم کیسے اس بات کی توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کی مغربی بنیادوں پر ایسی تعلیم و تربیت (جو مجموعی طور پر یورپ کے علمی و ثقافتی تجربوں اور ان کے تقاضوں پر مبنی ہے) مخالف اسلام اثرات سے پاک ہو سکتی ہے۔

ہماری اس توقع کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اگر ہم بعض ایسے غیر معمولی حالات کا استثناء کر دیں جن میں کسی انتہاء درجہ کے روشن اور فائق دماغ کے لئے ایسا ممکن ہوا کہ وہ اپنے ذہنی مفہام میں سے متاثر نہیں ہو سکا تو بھی عام اصول یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی مغربی تعلیم و تربیت ان کو اس قابل نہیں رکھے گی کہ وہ اپنے کو اس مخصوص ربانی تمدن کا نمائندہ سمجھیں جس کو اسلام لے کر آیا۔ اس میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان روشن خیالوں کے اندر دینی عقائد برابر مضلل ہوتے جا رہے ہیں جنہوں نے مغربی بنیادوں پر نشوونما حاصل کیا ہے۔“ (Islam at the Crossroads P.83,84)

پھر وہ نصاب تعلیم کے مختلف اجزاء کے متعلق علیحدہ علیحدہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس شکل میں جو اس وقت اکثر اسلامی اداروں میں رائج ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام مسلمان نوجوانوں کی نگاہ میں ایک اجنبی چیز بن جائے، یہی بات بلکہ اس سے بہت زیادہ یورپ کے فلسفہ تاریخ پر صادق آتی ہے، اس لئے کہ یورپ کا قدیم نظریہ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں: رومی (Romans) اور وحشی (Barbarians) تاریخ کو اس طرح پیش

کرنے کا ایک پوشیدہ مقصد ہے، وہ یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی اقوام اور ان کا تمدن ہر اس چیز سے زیادہ ترقی یافتہ ہے جس کا اس وقت تک وجود ہوا یا آئندہ کبھی دنیا میں وجود ہو سکتا ہے اس سے اہل مغرب کے حصول اقتدار کی کوشش اور مادی طاقت کا اخلاقی جواز پیدا ہوتا ہے اور وہ حق بجانب ثابت ہوتی ہے۔“ (Islam at the Crossroads P-95)

آگے چل کر وہ کہتے ہیں:

”تاریخ کی اس طرح کی تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے علاوہ کوئی اور اثر نہیں چھوڑ سکتی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت (کلچر) اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگیں اور مستقبل میں ان کے لئے ترقی و خدمت کے جو وسیع اور روشن امکانات ہیں، ان کا انکار کرنے لگیں۔ اس طرح وہ ایک ایسی منظم تربیت حاصل کرتے ہیں جس میں اپنے ماضی اور اپنے مستقبل کی حقارت پورے طور پر کارفرما ہوتی ہے، ان کے نزدیک ان کے مستقبل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مغربی معیار کے مطابق اور مغرب کے افکار و اقدار سے ہم آہنگ ہوں۔“ (Islam at the

Crossroads P-97)

آگے چل کر وہ بڑی جرات کے ساتھ کہتے ہیں:

”مگر مسلمانوں نے زمانہ ماضی میں علمی تحقیق و تفکر کے کام کو نظر انداز کر کے غلطی کی تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس غلطی کی اصلاح کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ مغرب کا نظام تعلیم جوں کا توں قبول کر لیں، ہماری پوری تعلیمی پسماندگی اور علمی بے بضاعتی اس مہلک اثر کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو مغرب کے نظام تعلیم کی اندھی تقلید، اسلام کی مخفی دینی طاقتوں پر ڈالے گی، اگر ہم اسلام کے جوہر کو یہ سمجھ کر محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک مستقل علمی و تہذیبی عنصر ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم مغربی تمدن کے ذہنی ماحول اور فضا سے دور دور رہیں، وہ فضا جو ہمارے معاشرہ اور ہمارے میلانات پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے تیار ہے۔ مغرب کے طور و طریق اور اس کے لباس و مظاہر زندگی کو قبول کر لینے سے مسلمان آہستہ آہستہ مغرب کے نقطہ نظر کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ خارجی مظاہر

کی تقلید اس ذہنی رجحان تک پہنچا دیتی ہے۔“ (Islam at the Crossroads P-100)

اس نتیجہ کی پیشین گوئی ان بعض مفکرین نے بھی کی ہے، جو ایشیائی اور مشرقی ممالک میں اس نظام تعلیم کو رواج دینے والے تھے، مشہور انگریز اہل علم لارڈ میکالے نے ۱۸۳۵ء میں اس تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے، جو یہ طے کرنے کے لئے تھی کہ ہندوستانیوں کو مغربی زبانوں کی تعلیم دی جائے۔

جایا کرے، اپنی رپورٹ میں لکھا تھا: ”ہمیں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو۔ یہ ایسی جماعت بنانی چاہئے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق اور رائے اور الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو۔“ (تاریخ التعليم از میجر پاسو، صفحہ ۸۶)

یہ مغربی نظام تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی لیکن خاموش نسل کشی (Genocide) کے مترادف تھا۔ عقلائے مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر اس سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جا بجا مراکز قائم کئے جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے اس سنجیدہ تاریخی حقیقت کو اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں بڑی خوبی سے ادا کیا ہے، ان کا مشہور شعر ہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی
ایک دوسرے شعر میں انہوں نے مشرقی و مغربی حکمرانوں کا فرق اس طرح بیان کیا ہے:

مشرقی تو سر دشمن کو کچل دیتے ہیں مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں
اس کے کئی برس بعد اقبال نے (جنہوں نے اس نظام تعلیم کا خود زخم کھایا تھا) اس حقیقت کو زیادہ سنجیدہ انداز میں اس طرح پیش کیا:

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی کہ ازوے روح توے می تو اں کشت
(ارمغان جاز صفحہ ۱۴۴)

تعلیم جو قلب ماہیت کرتی ہے اور جس طرح ایک سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ بناتی ہے، اس کو بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر
(ضرب کلیم)

وہ مغرب کے اس نظام تعلیم کو دین و اخلاق کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں:

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
(ضرب کلیم)

☆.....☆.....☆